AFKĀR *Journal of Islamic & Religious Studies*
Volume 4, Issue 1, June 2020, PP: 109-126
E-ISSN 2616-8588; P-ISSN 2616-9223
www.afkar.com.pk; hjrs.hec.gov.pk

Scan for download

ہجرتِ مدینہ: سیرت رسول ﷺ کا ایک روشن باب (استشراقی توجیہات کا تنقیدی مطالعہ)

Migration to Madinah: A Glorious Chapter of Sīrah

(A Critical Study of the Orientalists' Interpretations)

Sabahat Afzal [1] & **Abu Bakr** [2 *]
[1]Assisatant Professor, Institute of Islamic Studies, University of Punjab, Lahore, Pakistan
[2] Assistant Professor,Department of Arabic, University of Punjab, Lahore, Pakistan

ARTICLE INFO

Article History:
Received 24 July 2020
Revised 26 July 2020
Accepted 30 July 2020
Online 30 July 2020

DOI:

***Keywords**:*
Madinah,
Orientalists,
Glorious,
Role Model,
Sīrah,
Meccans.

ABSTRACT

The migration to Madinah is undoubtedly a revolutionary incident in the history of Islam. The stubborn and inflexible attitude of Meccans, their atrocities against the Muslims and the unending hurdles in the preaching of Islam were the major causes of this migration. Orientalists have penned mostly on the history of Islam with their interests and objectives. At one side, they describe the Islamic history, but more often they raise such discussions which contradict the basic conceptions of Islam. Likewise, about migration to Madinah, Orientalists have included some theories such as the real cause of this migration that need to be addressed such as, they referred that the migration to Madinah served as a great opportunity to Prophet Muhammad (peace be upon him) for gaining political power and making his followers economically strong and that Prophet Muhammad (peace be upon him) was invited to Madinah only as an arbitrator and not as a Prophet. In this article, an attempt has been made to point out the fallacies of such orientalist assumptions and theories. The article presents the point of view of the Orientalists and discusses with strong arguments subsequently to falsify their misconceptions. The research is a masterpiece for all those who have an interest in Sīrah and love reading rational reasoning on the sacredness of Islam.

[*]Corresponding Author's email: drabubakar70@gmail.com

CC BY

ہجرت مدینہ سیرت رسول ﷺ اور تاریخ اسلام کا وہ اہم ترین باب ہے جو اسلام کی ایک کامل عملی تصویر دنیا کے سامنے لے کر آیا۔ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں کم و بیش 13 سال تبلیغ کے بعد اذن الٰہی سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ جس طرح آپ ﷺ نے تبلیغ کا آغاز اللہ کے حکم سے کیا، اسی طرح تبلیغ کے لئے مکہ سے باہر جانے کا فیصلہ بھی اللہ کے حکم سے فرمایا۔ اس کے پس منظر میں قریش کی ہٹ دھرمی، مخالفتِ اسلام، مسلمانوں کو ایذا رسانی اور دعوتِ اسلام میں رکاوٹیں حائل کرنے جیسے عوامل کارفرما تھے۔ جب سے رسول اللہ ﷺ نے اعلانیہ دعوت کا کام شروع کیا تھا، آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے پیرکاروں کو مختلف قسم کے مظالم کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لیکن مسئلہ صرف مظالم سے نجات کا نہیں تھا، بلکہ دعوتِ اسلام کے اس عظیم فریضے کی تکمیل مقصود تھی جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو عطا کیا تھا۔ ان حالات میں رسول اللہ ﷺ کو یہی فکر لاحق ہو رہی تھی کہ مکہ سے باہر حمایتی تلاش کئے جائیں کیونکہ مکہ کی عمومی فضا تو ضد اور تعصب کا شکار تھی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے مدینہ سے آنے والے وفود کے مثبت رویے کو دیکھتے ہوئے مدینہ کی طرف ہجرت کا فیصلہ فرمایا۔ یہاں سے رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے اس مدنی دور کا آغاز ہوتا ہے جس کی نہ صرف اسلامی تاریخ میں بے پناہ اہمیت ہے بلکہ اس نے عالمی تاریخی کا دھارا بھی ہمیشہ کے لئے بدل کر رکھ دیا۔ ہجرتِ مدینہ کی اسی اہمیت کے پیش نظر سیرت پر قلم اٹھانے والے مغربی مصنفین نے ہجر تمدینہ کے اسباب و اثرات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اکثر اوقات مستشرقین کی طرف سے ان اسباب کی مادی تعبیر کی جاتی ہے اور آپ ﷺ کے مدینہ جانے کے فیصلے کو حکمرانی اور ملک گیری کی خواہش سے منسوب کیا جاتا ہے۔ انیسویں صدی کے برطانوی مؤرخ اے۔ جے۔ ٹوئن بی (ToynbeeA.J.) لکھتا ہے:

> The first stage in Muhammad's career is comparable with the career of Solon and the second stage with the career of Caesar.[1]
>
> محمد (ﷺ) کی عملی زندگی کے پہلے مرحلے کا موازنہ سولون (یونانی حکمران، قانون دان اور شاعر) کی زندگی سے کیا جاسکتا ہے جبکہ دوسرے مرحلے کا موازنہ سیزر کی زندگی سے کیا جاسکتا ہے۔

ٹوئن بی کی طرح کئی دیگر مستشرقین یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ مدینہ میں حضرت محمد ﷺ کی شخصیت، مکہ میں ان کی شخصیت سے بالکل جدا ہے اور یہ کہ جس خلوص کا دعویٰ انہوں نے مکہ میں کیا تھا وہ مدینہ میں باقی نہیں رہا۔ اس حوالے مستشرقین نے سیرت طیبہ کی جو مادی تعبیرات کی ہیں، ذیل میں ان کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

ہجرت مدینہ کو مکہ میں بحیثیت رسول ناکامی سے تعبیر کرنا

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اہل مکہ کے سخت رویئے اور دعوت اسلام کی راہ میں مسلسل رکاوٹیں ڈالنے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو ایک نئے مرکز کی ضرورت کا احساس ہوا۔ تاہم ہجرت رسول ﷺ کے پس منظر میں کوئی ایک سبب کارفرما نہیں تھا۔ اہل مکہ کا سخت رویہ اس کا اہم سبب ضرور بنا، تاہم ان کی ہر طرح کی مخالفت کے باوجود رسول اللہ ﷺ اپنی دعوتی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ آپ ﷺ کسی مایوسی کا شکار ہو گئے تھے جس کی بنا پر آپ ﷺ نے مکہ چھوڑنے کا ارادہ کیا بلکہ یہ فیصلہ اہل مدینہ کی درخواست پر اور اللہ کے حکم سے کیا گیا۔ کچھ مستشرقین نے ہجرت مدینہ کو بطور پیغمبر آپ ﷺ کی تبلیغ کی ناکامی سے تعبیر کیا ہے، مثلاً کیننسیل (Canon Sell) اس حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

> (ہجرت مدینہ) سے یہ ظاہر ہوا کہ مکہ میں محمد (ﷺ) کا کام ناکامی سے دوچار ہو گیا تھا۔ اہل مکہ نے یہ دیکھ لیا تھا کہ

> محمد (ﷺ) کے (بتائے گئے) نظام کا نفاذ شہری مطلق العنانیت کی طرف لے جائے گا جس کو تسلیم کرنے کے لئے وہ تیار نہ تھے۔ مدینہ میں (اسلام کی اشاعت) کے امکانا تزیادہ روشن تھے۔ یہود جس نجات دہندہ کی آمد کی امید کر رہے تھے اس نے آنے والے پیغمبر کے تصور کو عام کر دیا تھا۔ قبائلی انتشار اور تنازعات نے لوگوں کو تھکا دیا تھا، اور وہ ایک ایسے با اختیار شخص کی آمد سے واقعتاً خوش تھے جو ان کا حکمران بننے جا رہا تھا۔ ایک نئے سیاسی و مذہبی نظام کی بنیادیں رکھنے کی راہ ہموار ہو چکی تھی جس کے بارے میں رسول (ﷺ) نے بہت عرصہ غور و فکر کیا تھا اور جس کی انہیں بہت خواہش (بھی) تھی۔ ایک پیغمبر کی حیثیت سے محمد (ﷺ) مکہ میں ناکام ہو گئے تھے اور مدینہ میں وہ ایک سردار اور فاتح کے طور پر کامیاب رہے۔[2]

یہ بات کہنا کہ آپﷺ ایک پیغمبر کی حیثیت سے مکہ میں ناکام رہے اور مدینہ میں آپﷺ کی کامیابی ایک حکمران اور فاتح کی حیثیت سے تھی، آپﷺ کی تمام پیغمبرانہ مساعی کی نفی کے برابر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل مدینہ، مکہ میں آپﷺ کی دعوت و تبلیغ کے سبب ہی آپﷺ پر ایمان لائے اور اہل مدینہ میں اسلام کی اشاعت اُس وقت ہو رہی تھی جبکہ آپﷺ مکہ میں محض ایک مبلغ کی حیثیت سے موجود تھے۔ آپﷺ کو کوئی سیاسی قوت حاصل نہ تھی۔ پھر کیا وجہ تھی کہ اہل مدینہ ایک ایسے مبلغ کی دعوت سے متاثر ہوتے چلے گئے جسے اُس کے شہر کے لوگوں نے جھٹلا دیا تھا؟ کیا مدینہ میں آپﷺ کی آمد سے قبل اسلام کی اشاعت اس بات کا کافی ثبوت نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ صرف ایک مبلغ کی حیثیت سے بھی کامیاب رہے تھے؟ کیونکہ ناکام ہو جانے کی صورت میں آپﷺ کا پیغام اور دعوت بالکل مٹ جانی چاہئے تھی جبکہ ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ ایک ایسی قوم آپﷺ کی دعوت پر ایمان لے آئی جو آپﷺ کی جان کی حفاظت اپنی جانوں سے بھی بڑھ کر کرنے والی تھی۔

ہجرت مدینہ کی معاشی تعبیر

منٹگمری واٹ (W. Montgomery Watt) اہل مدینہ کی طرف سے حضورﷺ کو دعوت ہجرت دینے کی معاشی وجوہات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مدینہ کی معیشت کا زیادہ تر دارومدار کھجور و اور بعض اجناس کی کاشت پر تھا۔ کچھ تجارت بھی ہوتی تھی۔ ممکن ہے کہ اہل مدینہ بھی شمالی علاقوں میں تجارتی قافلے بھیجتے ہوں، مگر غالباً ان کی تجارت زیادہ تر غذائی اجناس پر ہی منحصر تھی۔ تجارت پر اصل اجارہ داری اہل مکہ کو ہی حاصل تھی۔ چنانچہ اہل مدینہ کے بقا کا اصل انحصار زراعت پر ہی تھا۔ لہذا آپﷺ کے مدینہ آنے کی صورت میں اہل مدینہ کے لئے اس بات کا امکان پیدا ہو سکتا تھا کہ وہ جزیرۃ العرب میں مکہ کی تجارتی اجارہ داری کو ختم کر سکیں۔ حضرت محمد (ﷺ) کے مدینہ آنے کے بعد قریش کے قافلوں پر حملے اور جنگوں کی صورت میں ان کو جو مال غنیمت ملا، اس سے بھی مدینہ کی معاشی صورتحال میں ایک اہم تبدیلی آئی۔[3]

واٹ کے مندرجہ بالا خیالات میں مارکس کی تاریخی مادیت کے فکری اثرات واضح طور پر جھلک رہے ہیں۔ مصنف نے اس مفروضے کی بنا پر کہ ہر اہم تبدیلی اور واقعے کے پس منظر میں معاشی عوامل کارفرما ہوتے ہیں، اہل مدینہ کی دعوت کو بھی معاشی عوامل سے منسوب کر دیا اور پھر پہلے سے طے شدہ اس نظریئے کے تحت وہ معاشی عوامل تلاش کئے جو مصنف کی نظر میں ان کی بدحال معیشت اور عرب کی تجارت پر قبضے کی خواہش ہے۔ یہ درست ہے کہ غزوات کے نتیجے میں اہل مکہ کی معیشت کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ مگر کیا اہل مدینہ کے لئے یہ ممکن

تھا کہ اس بات کا اندازہ اس وقت کر سکتے جب اہل مکہ ہر لحاظ سے طاقتور تھے اور بظاہر ان کی معیشت کو نقصان پہنچنے کا کوئی اندیشہ موجود نہیں تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ اگر اہل مکہ مسلمانوں کے ساتھ ٹکراؤ کا راستہ اختیار نہ کرتے اور جنگوں میں اپنے وسائل نہ جھونکتے تو ان کی معیشت پہلے کی طرح مضبوط رہتی، کیونکہ بہر حال وہ حرم کے رکھوالے تھے اور جزیرۃ العرب میں ایک مقام رکھتے تھے۔ یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں کہ اہل مدینہ نے مکہ کے تجارتی مقام پر قبضے کی خاطر رسول اللہ ﷺ کو مدینہ آنے کی دعوت دی ہو جبکہ اس وقت نہ وہ آنے والے حالات سے واقف تھے نہ اہل مکہ کی شدید جارحانہ پالیسیوں کے بارے میں کوئی اندازہ لگا سکتے تھے۔

کچھ مستشرقین یہ تاثر دیتے نظر آتے ہیں کہ اہل مکہ نے اسلام اس لئے قبول نہیں کیا کیونکہ وہ ان کی معیشت کے لئے خطرہ تھا اور اہل مدینہ نے اسلام قبول کرنے میں اس لئے کوئی تامل نہیں کیا کیونکہ ان کی معیشت کو اس سے کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ کیرن آرمسٹرانگ (Karen Armstrong) ایسے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> In Mecca, Muhammad's teaching threatened to damage the cult of the Haram, which was crucial to the economy, but there was no sanctuary full of idols in Yathrib.[4]
>
> مکہ میں محمد (ﷺ) کی تعلیمات حرم کے مذہبی نظام کے لئے خطرہ تھیں، جو کہ معیشت کے لئے ایک فیصلہ کن مقام رکھتا تھا۔ تاہم، مدینہ میں بتوں سے بھری ایسی کوئی مقدس عمارت نہ تھی۔

یہاں بھی مارکسی فکر کے اثرات واضح طور پر محسوس کئے جاسکتے ہیں۔ گویا مصنفہ کے نزدیک وہ اصل عامل جو کسی نظریئے کی قبولیت یا عدم قبولیت میں اہم کردار ادا کر رہا ہے، معیشت ہی ہے۔ جو چیز معیشت کے لئے خطرہ ہے، قبول نہیں کی جاسکتی اور جو معیشت کے لئے خطرہ نہیں اسے قبول کرنے میں لوگ ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ مکہ کی مجموعی معیشت کو اسلام سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ حرم کی اسی طرح تعظیم کی تھی جیسا کہ دین ابراہیمی میں کی جانی چاہئے۔ چنانچہ مکہ کی وہ معیشت جو حرم سے وابستگی کے باعث ایک خصوصی تحفظ رکھتی تھی، اسلام قبول کر لینے کے بعد اور زیادہ محفوظ ہو سکتی تھی۔ دوسری طرف یہ کہنا بھی درست نہیں کہ قبول اسلام کی صورت میں اہل مدینہ کو کوئی معاشی خطرہ درپیش نہیں تھا۔ بلکہ ہجرت مدینہ کے وقت قریش کی شدید دشمنی کو دیکھتے ہوئے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اہل مکہ رسول اللہ ﷺ کو پناہ دینے کی صورت میں انہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ (جیسا کہ بعد میں مدینہ کی چراگاہوں پر حملے جیسے واقعات سے ثابت ہوا۔) لہذا یہ ممکن نہ تھا کہ اہل مدینہ اس حوالے سے کسی بھی قسم کے اندیشے سے خالی ہوں۔ وہ بخوبی اس بات کے مضمرات کا اندازہ لگا سکتے تھے۔ اسکے باوجود اگر وہ اسلام پر ایمان لے آئے تو اس کا سبب سوائے اس کے اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ وہ اس دین کی حقانیت کے صدقِ دل سے قائل ہو گئے تھے اور ان کے پیش نظر یہ خواہش تھی کہ وہ اس راہِ حق کے اولین مسافر بن جائیں نہ کہ اس دین کے ذریعے کوئی معاشی فوائد حاصل کر لیں۔

اہل مدینہ کی طرف سے حضور ﷺ کو بطور ثالث مدینہ بلائے جانے کا نظریہ

مستشرقین کا ایک اور مقبول مفروضہ یہ ہے کہ یثرب میں باہمی قبائلی آویزش (اوس و خزرج کے مابین) وہ اہم سبب تھا جس کے خاتمے کے لئے اہل مدینہ نے آپﷺ کو مدینہ آنے کی دعوت دی۔ یعنی انہوں نے آپﷺ کو ایک رسول کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ثالث کی حیثیت سے مدینہ بلایا تھا۔ منٹگمری واٹ مدینہ کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> Medina was thus suffering from a malaise as serious as that of Mecca, but completely different in its symptoms, though the underlying disease is similar, namely, the incompatibility of nomadic standards and custom...in fine, nomadic ideology...with life in a settled community.[5]

منٹگمری واٹ مزید لکھتا ہے کہ اوس و خزرج کے درمیان یہ جنگیں ان کی بقا کے لئے ایک خطرہ بن چکی تھیں۔ حضرت محمدﷺ کی نبوت کو تسلیم کر لینے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا کہ مدنیہ کو سیاسی استحکام اور امن حاصل ہو جاتا:

> The Ansar thus had a solid material reason for accepting Muhammad as a prophet.[6]

پس انصار کے پاس محمد (ﷺ) کو بطور پیغمبر قبول کرنے کی ایک ٹھوس مادی وجہ موجود تھی۔

ایک اور مقام پر واٹ اس نقطہ نظر پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے:

> عرب کے مؤثر ترین قبائل آٹھ یا کچھ زیادہ تھے، جو تقریباً سبھی سنگین تنازعات میں مبتلا ہو چکے تھے۔ 618ء کے لگ بھگ ہونے والی ایک جنگ میں کافی خوں بہہ چکا تھا اور مکمل امن بحال نہیں ہو سکا تھا۔ محمد (ﷺ) کو مدینہ بلانے سے وہاں کے بہت سے عرب لوگ یہ امید کر رہے تھے کہ وہ مخالف گروہوں کے درمیان ایک ثالث کا کردار ادا کریں گے اور ممکن ہے کہ یہود کے ساتھ ان کے روابط نے انہیں ایک مذہبی مسیحا کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار کر دیا ہو جو انہیں ظلم سے رہائی دلوا کر ایک ایسی بادشاہت قائم کرے گا جس میں انصاف کا دور دورہ ہو۔[7]

ایچ۔ اے۔ آر۔ گب (H.A.R. Gibb) بھی یہی نقطۂ نظر پیش کرتے نظر آتے ہیں کہ رسول اللہﷺ کو اہل مدینہ نے صرف ایک ثالث کا کردار ادا کرنے کے لئے اور امن قائم کرنے کی غرض سے بلایا تھا، وہ لکھتا ہے:

> تھک کر اور اس بات سے گھبرا کر کہ کہیں یہودی قبائل ان کی اس کمزوری سے فائدہ نہ اٹھائیں، اہل مدینہ نے محمد (ﷺ) سے استدعا کی کہ وہ بطور ثالث اور امن قائم کرنے کے لئے مدینہ تشریف لے آئیں۔ اپنے معمول کے احتیاط کے ساتھ محمد (ﷺ) نے پہلے اپنے تحفظِ منصب اور اپنے پیروکاروں کے مدینہ آنے کی ضمانت وصول کی۔ مذاکرات ایک یا دو سال تک طول کھینچتے رہے۔ تاہم بالآخر، 622ء کے موسم خزاں میں محمد (ﷺ) خفیہ طور پر مکہ سے فرار ہو گئے، اپنی تلاش کرنے والوں سے بچ کر نکل گئے اور خود کو ایک نئے ٹھکانے پر آباد کر لیا۔[8]

مارگولیتھ (Margoliouth) ہجرت مدینہ کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ مدینہ کے بعض لوگ تسلسلِ جنگ کے باعث اس بات کی خواہش کرنے لگے تھے کہ اپنے تنازعات حل کرنے کے لئے انہیں ایک نبی مل جائے۔ اس کام کو انجام دینے کے لئے محمد (ﷺ) کو دعوت دی گئی، اور اسے قبول کر لیا گیا، اور انہوں نے دانشمندانہ طور پر اپنے پیروکاروں کو خود سے پہلے اس لئے

یثرب بھیج دیا تا کہ ان کے وہاں پہنچنے پر وہ بطور محافظ ان کے لئے خدمات انجام دے سکیں۔[9] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں بڑے فیصلہ کن انداز میں ہجرت مدینہ کا سبب یوں بیان کیا جاتا ہے:

اس بارے میں کوئی شک ہی نہیں کہ اہل مدینہ ایک الہامی رہنمائی کے حامل مبلغ کی اتنی خواہش نہیں رکھتے تھے جتنی ایک سیاسی رہنما کی۔ ایسا رہنما جو اُن کے سیاسی تعلقات کو از سر نو ترتیب دے سکے، جو جنگ بعاث کے نتیجے میں پیدا ہونے والے قبائلی اختلافات کے باعث بالکل تباہ ہو چکے تھے۔[10]

انسائیکلوپیڈیا بریٹینکا میں بھی "محمد" (ﷺ) کے عنوان سے مضمون میں ڈی۔ ایس۔ مارگولیتھ نے ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔[11] مستشرق ڈرمنگھم (Emile Dermengham) بھی اہل مدینہ کی دعوت کو سیاسی و معاشرتی وجوہات سے منسوب کرتے ہوئے لکھتا ہے:

(they) invited him to make yathrib (al-Madinah) his home, hoping thereby to secure a means for reconciling the hostile Aws and Khazraj.[12]

انہوں نے آپ ﷺ کو دعوت دی کہ یثرب (مدینہ) کو اپنا وطن بنالیں، یہ امید کرتے ہوئے کہ اس طرح انہیں باہم دشمن (قبائل) اوس و خزرج کے درمیان صلح کرانے کا ایک وسیلہ مل سکتا ہے۔

منٹگمری واٹ ایک اور مقام پر مدینہ کے سماجی حالات کو وہ بنیادی سبب قرار دیتے نظر آتے ہیں جن کے باعث اہل مدینہ نے رسول اللہ ﷺ کو مدینہ آنے کی دعوت دی، منٹگمری واٹ کے بقول اسلام اہل مدینہ کو ان کی سماجی مشکلات سے نجات کا موقع فراہم کر رہا تھا۔ بنیادی تبدیلی یہ تھی کہ اب مدینہ کا معاشرہ خونی رشتہ داری کی پرانی اساس کی بجائے ایک نئی بنیاد پر متحد ہونے جا رہا تھا، یعنی مذہب، اور اس نئے اتحاد کے ذریعے ان کا اندرونی ٹکراؤ ختم ہو سکتا تھا۔ اہل مدینہ اپنی سرد جنگ سے اس قدر تھک چکے تھے کہ وہ کوئی بھی ایسا راستہ اختیار کرنے کے لئے تیار تھے جس سے انہیں سکون مل سکتا ہو؛ اور لوگوں میں یہ احساس اس قدر شدت اختیار کر چکا تھا کہ عبد اللہ بن ابی جیسے لوگ ایسے کسی فیصلے کے خلاف نہیں جا سکتے تھے خواہ وہ ان کے انفرادی مفادات کے کتنا ہی خلاف کیوں نہ ہو۔ عقیدے کے بارے میں یہود پہلے ہی زمین ہموار کر چکے تھے۔ البتہ اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ دین محمد (ﷺ) کے سماجی اثرات اہل مدینہ کے لئے زبردست کشش رکھتے تھے۔[13]

مستشرق فلپ کے حتی کے نزدیک بھی رسول اللہ ﷺ کو مدینہ دعوت دینے کے پیچھے اہل مدینہ کے معاشرتی و سیاسی مسائل تھے جن کا حل انہیں رسول اللہ ﷺ کی ذات میں ملتا نظر آ رہا تھا، وہ لکھتا ہے:

Two years later a deputation of about seventy-five men invited him to make Yathrib(al-Madinah) his home,hoping thereby to secure a means for reconciling the hostile Aws and Khazraj.[14]

دو برس بعد، پچھتر آدمیوں کے ایک وفد نے انہیں دعوت دی کہ یثرب (مدینہ) کو اپنا وطن بنالیں، یہ امید کرتے ہوئے کہ اس طرح انہیں دشمن (قبائل) اوس و خزرج کے درمیان صلح کرانے کا ایک وسیلہ مل سکتا ہے۔

برنارڈ لیوس (Bernard Lewis) نے بھی یہی نقطۂ نظر ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

اہل مدینہ نے آپ ﷺ کو دعوت دیتے ہوئے اس بات کو اتنا مد نظر نہیں رکھا تھا کہ آپ خدا (کے منتخب کردہ) بندے

ہیں جتنا اس بات کو کہ آپﷺ ایک غیر معمولی طاقت رکھنے والی روح کے قبضہ میں ہیں اور ایک ثالث کے طور پر ان کے کام آسکتے تھے اور ان کے باہمی تنازعات حل کر سکتے تھے۔ ابتدا میں اسلام ان کے لئے بطور مذہب اتنا مفید نہیں تھا جتنا ایک ایسے نظام کے طور پر جو انہیں تحفظ اور تنظیم فراہم کر سکتا تھا۔۔۔ اہل مکہ کے برعکس، بت پرستی سے ان کے کوئی مفادات وابستہ نہیں تھے اور وہ اسلام کے مذہبی پہلو کو ثابت ہونے پر قبول کر سکتے تھے بشرطیکہ وہ ان کی سیاسی اور سماجی ضروریات کو پورا کر سکے۔[15]

اپنے معتدل خیالات کے لئے معروف جان ایل ایسپوزیٹو (John L. Esposito) بھی اس معاملے میں سابقہ مستشرقین کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں:

> Muhammad was invited by a delegation from Yathrib...to serve as a chief arbitrator or judge in a bitter feud between its Arab tribes.[16]

> محمد (ﷺ) کو یثرب سے آنے والے ایک وفد کی طرف سے دعوت دی گئی تھی کہ وہ ان کے عرب قبائل کے درمیان شدید نوعیت کے جھگڑوں میں ایک ثالث یا منصف کا کردار ادا کریں۔

ان تمام مصنفین نے اس ایک نقطہ پر زور دیا ہے کہ رسول اللہﷺ کو اہل مدینہ نے درحقیقت اس وجہ سے خوش آمدید کہا تھا کہ ان کے ذریعے وہ ایک پر امن شہر کے حصول کو ممکن بنا سکتے تھے۔ اس نقطۂ نظر کی بنیاد محض یہ ہے کہ اوس و خزرج باہمی جنگ و جدل سے تباہ ہونے کو تھے اور تباہی کے اس شیطانی چکر سے نکلنا چاہتے تھے۔ یہ بات تاریخی طور پر درست سہی مگر یہ کہنا کہ رسول اللہﷺ کو انہوں نے اس مقصد کے لئے یثرب آنے کی دعوت دی تھی، محض ایک گمان اور قیاس ہے۔ تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ آپﷺ کے آنے سے پہلے عبد اللہ بن ابی کی سرداری پر تقریباً اتفاق ہو چکا تھا[17] مزید یہ کہ رسول اللہﷺ کی آمد سے انصار ایک پر امن مدینہ کی توقع اس لئے نہیں کر سکتے تھے کہ رسول اللہﷺ نے خود ان سے اس بات کی بیعت لی تھی کہ وہ ہر صورت میں رسول اللہﷺ کا دفاع کریں گے اور انکی جان کو اپنی جان سے بڑھ کر عزیز رکھیں گے۔ اس صورتحال میں کہ جب اہل مکہ رسول اللہﷺ کے جانی دشمن بن چکے تھے، کیا اہل مدینہ کو یہ نظر نہیں آرہا تھا کہ آپﷺ کے مدینہ جانے کے بعد وہ چین سے نہیں بیٹھیں گے اور رسول اللہﷺ کو نقصان پہنچانے کا ہر طریقہ آزمائیں گے؟ یقیناً انہیں یہ معلوم تھا۔ حضرت عباس بن عبادہ بن نضلہ انصاری کی تقریر محفوظ ہے، جس میں انہوں نے فرمایا:

> "اے معشر خزرج! تم جانتے بھی ہو کہ تم کس بات پر ان صاحب سے بیعت کر رہے ہو؟" سب نے کہا: "ہاں، ہم جانتے ہیں۔" کہا: "یہ بیعت اس بات کی ہے کہ ہر سرخ و سیاہ آدمی سے تم کو لڑنا ہو گا۔ پس اگر تم یہ دیکھو کہ جب تمہارے مال و اسباب برباد ہوں گے اور تمہارے اشراف قتل ہو جائیں گے، اس وقت تم ان کی بیعت سے پھر جاؤ گے تو اسی وقت ان کی بیعت کو ترک کر دو۔ قسم خدا کی اگر اس وقت تم نے ایسا کیا تو دنیا اور آخرت کی ذلت تم کو نصیب ہو گی۔ اور اگر تم یہ جانتے ہو کہ چاہے کیسی ہی مصیبت تم کو پہنچے، مال برباد ہو یا اشراف قتل ہوں، تم اپنی بیعت پر قائم رہو گے تو پھر بسم اللہ کر کے بیعت کرو۔"[18]

تحریر کا ایک ایک لفظ واضح کرتا ہے کہ اہل مدینہ آپ ﷺ کو مدینہ بلانے کے عواقب و نتائج سے مکمل طور پر آگاہ تھے۔ لہذا یہ کہنا کہ انہوں نے آپ ﷺ کو محض اپنے علاقائی امن کی بحالی کے لئے وہاں دعوت دی تھی، حقائق کے ساتھ کھلواڑ کے سوا کچھ نہیں۔

مستشرقین اس اہم ترین نکتہ کو اس لئے بھی نظر انداز کر دیتے ہیں کہ آگے چل کر انہیں غزوات کو رسول اللہ ﷺ کی جارحانہ کاروائیاں

قرار دینا ہے، اگر شروع میں ہی وہ اس بات کا اعتراف کر لیں کہ رسول اللہ ﷺ کو اہل مکہ کی طرف سے شدید کاروائی کا اندیشہ تھا تو غزوات کو لوٹ مار کے لئے کی جانے والی خونریز کاروائیوں کے طور پر کیسے پیش کر سکیں گے۔

ان تمام مصنفین نے اوس و خزرج کی قبائلی جنگوں کو جس قدر بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے، اس کے باعث یہ جاننا ضروری ہو جاتا ہے کہ کیا یہ جنگیں اتنی ہی غیر معمولی شدت کی حامل تھیں کہ ان کے باعث اہل یثرب باہر سے کوئی حکمران لانے کو تیار ہو جائیں یا پھر جنگ و جدل ایک ایسا معاملہ تھا جو عرب قبائل کے مابین عام تھا۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ قبائلی جنگیں اس دور میں جزیرۃ العرب کا معمول تھیں۔ تامس کیرنین (Thomas Kiernan) لکھتا ہے:

> زندگی سے یکسانیت دور کرنے کیلئے اور انتہائی گہرے جنگجو محرکات کی بنا پر قبائل نے ایسی سرگرمیوں (قافلوں کی لوٹ مار اور باہم جنگ و جدل) میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ بعض اوقات خاص مقاصد کے حصول کے لئے بھی یہ کام کئے جاتے، کبھی دوسرے قبیلے پر اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے یا کسی قبیلے سے پرانا بدلہ لینے کے لئے۔ بہر حال کوئی بھی وجہ ہو، ہیروازم کا جنون اور اپنے قبیلے کی شان و شوکت میں اضافے کا شوق صحرا کی روایت بن گیا۔[19]

فلپ کے حتیٰ ایام العرب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ایام العرب قبائل کی وہ باہمی دشمنیاں ہیں جو مویشیوں، چراگاہوں اور چشموں پر ہونے والے جھگڑوں کی بنا پر ہوتی تھیں۔ یہ (جھگڑے) لوٹ مار کی کاروائیوں، حریف قبائل کے حامیوں کی تنہا جرأتمندانہ (بطلی) کاروائیوں کے اظہار کیلئے اور جنگجو قبائل کے ترجمان شاعروں کے درمیان شدید طنزیہ ہجو کے تبادلے کیلئے کافی مواقع فراہم کرتیں..... یہ ایام العرب بدوی صحرا کی آبادی میں ممکنہ غیر ضروری اضافے کے لئے ایک محفوظ نکاسی فراہم کرتے تھے، وہ صحرا جس کے باشندے عموماً نیم قحط زدہ حالت میں رہتے تھے اور جن کے لئے لڑاکا مزاج ہونا ایک مستقل ذہنی کیفیت تھی۔[20]

مغربی مصنفین کے اپنے بیانات سے واضح ہو رہا ہے کہ قبائلی جنگیں اس دور میں عرب کا معمول تھیں اور یہ کوئی باعث حیرت امر نہ تھا کہ معمولی باتوں پر دو قبائل کے درمیان طویل جنگ و جدل کا آغاز ہو جائے۔ یعنی یہ صرف اوس و خزرج جیسے قبائل ہی کا معاملہ نہیں تھا بلکہ اکثر عرب قبائل اسی صورتحال سے دوچار رہتے تھے۔ لہذا یہ رائے کہ اوس و خزرج نے محض جنگ و جدل کا خطرہ ٹالنے کے لئے اور قیام امن کے لئے آپ ﷺ کو مدینہ آنے کی دعوت دی تھی، کوئی ٹھوس بنیاد نہیں رکھتی۔ اگر ایسا تھا تو پھر رسول اللہ ﷺ کا ساتھ دینے کی صورت میں اہل مدینہ نے قریش سے جنگ کا خطرہ مول کیوں لیا؟ ایسی صورت میں تو انہیں چاہئے تھا کہ فوراً قریش کی دھمکی پر سر تسلیم خم کر دیتے۔ جہاں تک

منٹگمری واٹ کا تعلق ہے تو مدینہ کی جن خونریز جنگوں کو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی مدینہ میں آمد کا سبب قرار دیا ہے، ان کے بارے میں وہ خود ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ اوس اور خزرج ایک دوسرے کے ساتھ لگا تار جنگیں لڑتے رہتے تھے تاہم اکثر اوقات ان جنگوں میں صرف ایک یا دو چھوٹے قبائل شریک ہوتے تھے۔[21] جبکہ ایک اور مقام پر وہ لکھتا ہے کہ بدر کے موقع پر قریش کے 15 قبائل کی نمائندگی کے مقابلے میں اوس و خزرج کے 33 قبائل سے تعلق رکھنے والے افراد موجود تھے۔[22] گویا خود اس کے اپنے بیان سے معلوم ہو رہا ہے کہ وہ خونریز جنگیں جن سے "گھبرا کر" اوس و خزرج نے آپ ﷺ کو مدینہ دعوت دی تھی، ان میں تو اوس و خزرج کے ایک یا دو قبائل کی شرکت ہوتی تھی جبکہ رسول اللہ ﷺ کی حمایت و نصرت کے بعد انہیں جس جنگ سے دوچار ہونا پڑا اس میں ایک دو نہیں بلکہ اوس و خزرج کے 33 گروہ شریک تھے۔ پھر آخر کیوں اوس و خزرج نے مدینہ کے اندرونی امن کے لئے ایک ایسی شخصیت کو مدینہ دعوت دی جن کے دفاع میں انہیں اپنی باہمی جنگوں سے بھی کہیں زیادہ خطرناک جنگ کا خطرہ مول لینا پڑا؟

جہاں تک منٹگمری واٹ کی اس رائے کا تعلق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی شکل میں اہل یثرب کو ایک ایسا شخص مل رہا تھا جو ان دو قبائل میں صلح کرانے کی بہترین صلاحیت رکھتا تھا تو یہاں بھی اس بات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کیا ایسا کوئی اور شخص اوس و خزرج کو دستیاب نہیں تھا جس پر دونوں قبائل صلح کر سکیں؟ تاریخ کا جواب تو یہی ہے کہ ایسا شخص عبد اللہ بن ابی کی صورت میں انہیں میسر آچکا تھا۔ خود مستشرقین نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ عبد اللہ بن ابی مدینہ میں قیامِ امن قائم کے لئے ایک موزوں انتخاب ہو سکتا تھا:

> A certain Khazrajchief , a man of moderate views and peaceful temperament , had refused to take part in the fighting and had used every effort to end the fratricidal strife. His name was 'Abdullah ibnUaby.[23]

> معتدل نظریات اور امن پسند مزاج رکھنے والے ایک خزرجی سردار نے جنگ میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا اور اس گروہی کشمکش کو ختم کرنے کے لئے ہر طرح کی کوشش کی تھی۔ اس کا نام عبد اللہ بن ابی تھا۔

اس صورتحال میں کہ جب عبد اللہ بن ابی کی صورت میں ایک موزوں شخص موجود تھا، اوس و خزرج کو رسول اللہ ﷺ کو صرف بحیثیت ثالث مدینہ دعوت دینے کی کیا ضرورت پیش آسکتی تھی۔ صاف ظاہر ہے کہ ان کا رسول اللہ ﷺ کو مدینہ آنے کی دعوت دینا اس گہری عقیدت و احترام اور محبت کے باعث تھا جو آپ ﷺ پر ایمان لانے کے بعد ان کے دلوں میں راسخ ہو چکی تھی اور جس کا ثبوت بعد کے حالات میں انہوں نے بارہا دیا۔ خود مستشرقین نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ انصار نے رسول اللہ ﷺ سے اس بات پر بیعت کی تھی کہ وہ آپ ﷺ کی حفاظت اسی طرح کریں گے جیسے اپنے گھر والوں کی کرتے ہیں۔ ڈر منگھم لکھتے ہیں:

> انہوں نے لوگوں سے استدعا کی کہ وہ اعلانیہ صرف اس سچے رب کی عبادت کریں اور اس کی جو خدا کا رسول ہے، اطاعت کریں، اچھے اور برے دونوں طرح کے حالات میں اور مکہ کے مسلمانوں کو بھی ویسا ہی تحفظ فراہم کریں جیسا وہ اپنے بیوی بچوں کو فراہم کرتے ہیں۔[24]

دیگر مغربی مصنفین بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اہل یثرب نے حضرت محمد ﷺ کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا۔ مثلاً فلپ کے۔ حتی لکھتے ہیں:

> On a lucky day he signed with delegation from that city a contract

which assured him and his followers protection in their new home…[25]

ایک خوش قسمت روز انہوں نے اُس شہر سے آنے والے وفد کے ساتھ ایک معاہدہ پر دستخط کئے، جس میں انہیں اور ان کے پیروکاروں کو ان کے نئے وطن میں تحفظ کا یقین دلایا گیا۔

بعض مستشرقین نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ اہل مدینہ نے رسول اللہ ﷺ کو بحیثیت ایک پیغمبر اور ایک روحانی ہادی کے طور

پر دعوت دی تھی۔ مگر ساتھ ہی انہوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش بھی کی ہے کہ اہل مدینہ اس بات سے شاید بے خبر تھے کہ حضرت محمد ﷺ نبوت کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی اہم کردار ادا کریں گے۔ گستاف ای فان گریونے باوم(Gustave E. vonGrunebaum) لکھتا ہے:

The invitation to Muhammad to leave Mecca and settle in Yathrib naturally signified that he was recognized as a prophet, though it is not clear whether political rights were accorded to him.[26]

محمد(ﷺ) کو مکہ چھوڑ کر مدینہ آباد ہونے کی دعوت دینے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں ایک پیغمبر کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا تھا، اگرچہ یہ بات واضح نہیں کہ انہیں سیاسی حقوق دیئے گئے تھے کہ نہیں۔

کئی اور مستشرقین مثلا فرانسیسکو جبریئیل (Francesco Gabrieli)، الفریڈ گیوم(Alfred Guillaume)[27] اور کینیتھ کریگ(Kenneth Cragg)[28] نے بھی اس بات کا ذکر کیا ہے کہ انصار نے حضرت محمد ﷺ سے ہر طرح کے تحفظ کا عہد کیا تھا۔

مستشرقین کے اس نظریے کی بنیاد کہ اوس وخزرج نے قیام امن کے لئے آپ ﷺ کو مدینہ دعوت دی تھی، ابن ہشام کی یہ روایت ہے جس میں آتا ہے کہ جب مدینہ کے پہلے گروہ (جو خزرج میں سے تھا) نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر اسلام قبول کر لیا تو قبول اسلام کے بعد انہوں نے آپ ﷺ سے عرض کیا:

بیشک ہم نے اپنے پیچھے ایک ایسی قوم چھوڑی ہے کہ جس سے بڑھ کر باہمی عداوت ودشمنی کسی اور قوم میں نہیں ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کے ذریعے انہیں اکٹھا کر دے۔ پس ہم ان کے پاس جائیں گے اور انہیں آپ ﷺ کے امر کی طرف بلائیں گے اور ان کے سامنے آپ ﷺ کا وہ دین پیش کریں گے جس پر ہم ایمان لائے ہیں۔ پس اگر اللہ نے انہیں اس پر جمع کر دیا تو آپ ﷺ سے بڑھ کر معزز وطاقتور شخص کوئی نہ ہوگا۔[29]

بظاہر یہی روایت مستشرقین کے اس تصور کی بنیاد بنی کہ رسول اللہ ﷺ کو مدینہ آنے کی دعوت دینے کا مقصد اوس وخزرج کے مابین اتحاد پیدا کرنا تھا۔ یہ روایت اس لیے قابل اعتماد نہیں کہ اس میں بات کرنے والے مجہول ہیں۔ مزید براں اس روایت سے صرف اتنا معلوم ہو رہا ہے کہ آپ ﷺ پر ایمان کے ذریعے انہیں اوس وخزرج کے مابین امن بحال کرنے کی امید پیدا ہوئی۔ یہ ثابت نہیں ہو رہا کہ اہل یثرب نے رسول اللہ ﷺ کو یثرب تشریف لانے کی دعوت بھی اسی لئے دی۔ روایت کا آخری حصہ خصوصا اس کے ضعیف ہونے کہ طرف اشارہ کرتا

ہے۔ کیونکہ محض اوس و خزرج کی حمایت سے عرب میں سب سے طاقتور حکمران بننے کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ اہل یثرب نہ تو اتنے طاقتور اور نہ تعداد میں اتنے زیادہ تھے کہ ایسا سوچا جائے اور نہ ہی ان کی جنگجو صلاحیتیں عرب کے باقی قبائل کے مقابلے میں بہت نمایاں تھیں۔ یہ آخری جملہ اگر درست مان بھی لیا جائے تو یہ بات کہنے کی وجہ عرب کا عمومی انداز تھا کہ جس میں وہ اپنے قبیلے کی شان میں مبالغہ کرنے کے عادی تھے۔

اس بات کی ایک اور اہم دلیل کہ اہل یثرب نے آپ ﷺ کو باہمی مصالحت کے لئے نہیں بلکہ بطور پیغمبر مدینہ بلایا تھا، یہ بھی ہے کہ بیعت عقبہ اولیٰ اور عقبہ ثانیہ دونوں میں سے کسی میں بطور ثالث رسول اللہ ﷺ کے کردار کا ذکر نہیں تھا۔ تاہم اس بات پر بیعت ضرور لی گئی تھی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی جان کی حفاظت اسی طرح کریں گے جس طرح اپنے بیوی بچوں کی حفاظت کرتے ہیں۔[30] جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت میں ہر طرح کے خطرات مول لینے کو تیار تھے اور یہ تبھی ممکن تھا جب وہ بطور پیغمبر آپ ﷺ پر صدق دل سے ایمان لائے ہوں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اوس و خزرج آپ ﷺ کو بطور پیغمبر تسلیم کرتے ہوئے آپ ﷺ کو مدینہ آنے کی دعوت دے رہے تھے نہ کہ محض ایک ثالث کے طور پر۔

منٹگمری واٹ خو ایک جگہ اپنے نقطۂ نظر کی یہ کہہ کر تردید کر دیتے ہیں کہ رسول اللہ کی سیاسی قوت و مقام کو تمام اہل مدینہ نے تسلیم نہیں کیا تھا۔

> Muhammad came to Medina with his religious claims accepted, at least nominally by the majority of the Arabs there, even though his political powers were no greater than those of a clan chief.[31]

> محمد (ﷺ) اپنے مذہبی دعویٰ کے قبول کئے جانے کے بعد ہی مدینہ آئے، کم از کم نام نہاد طور پر وہاں کی عرب اکثریت کے یہ تسلیم کر لینے کے بعد، اگرچہ ان کے سیاسی اختیارات ایک چھوٹے قبائلی سردار سے زیادہ نہ تھے۔

جب مدینہ کی آبادی کا ایک نمایاں حصہ ابھی تک غیر مسلم تھا تو یہ نقطہ نظر کیسے درست قرار دیا جا سکتا ہے کہ مدینہ کی مسلم آبادی آپ ﷺ کے ذریعے مدینہ میں قیام امن کا خواب دیکھ رہی تھی جبکہ اس وقت انہیں یہ قطعی طور پر معلوم نہیں تھا کہ تمام اہل مدینہ رسول اللہ ﷺ کو بآسانی اپنا حاکم تسلیم کر لیں گے یا نہیں۔

ہر وہ شخص جو تعصب کی عینک اتار کر دیکھے گا، یہ ماننے میں دیر نہیں لگائے گا کہ اہل یثرب کی دعوت کے پیچھے ان کی رسول اللہ ﷺ سے وہ انتہائی عقیدت و محبت کارفرما تھی جس کا آنے والے وقت میں کئی بار ثبوت ملا۔ آپ ﷺ کے استقبال میں ان کی بے چینی، آپ ﷺ کی مہمان نوازی میں سبقت لے جانے کی خواہش، راتوں کو جاگ کر آپ ﷺ کے حجرے کا پہرہ دینا، آپ ﷺ کے حکم پر اپنے مہاجر بھائیوں کے لئے ہر طرح کی قربانی کے لئے تیار ہو جانا، قریش سے جنگ کی نوبت آنے پر بے سروسامانی کے باوجود بے خوف ہو کر مقابلے کے لئے ڈٹ جانا، یہ سب تاریخی حقائق پکار پکار کر کہتے ہیں کہ اہل مدینہ آپ ﷺ کی اطاعت کو صدق دل سے قبول کر چکے تھے اور ہر طریقے سے آپ ﷺ کی خوشنودی کے طلبگار تھے۔ اس معاملے میں وہ کسی بھی قسم کی غرض سے بالاتر تھے۔ انصار کی رسول اللہ ﷺ سے محبت و عقیدت کا اندازہ آپ ﷺ کی اس تقریر سے بھی کیا جا سکتا ہے جو آپ ﷺ نے غزوہ حنین کے مال غنیمت کی تقسیم پر اٹھنے والے سوالات کا جواب دینے کے لئے فرمائی تھی کہ کیوں آپ ﷺ نے انصار کو اس جنگ میں بھرپور شرکت کے باوجود مال غنیمت میں حصہ نہیں دیا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ”اے گروہ انصار

!کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ میں تمہارے پاس اس حالت میں آیا کہ تم گمراہ تھے، پھر اللہ نے تمہیں میرے ذریعہ ہدایت دی، تم مفلس اور نادار تھے پھر اللہ نے تمہیں میرے ذریعے مال و دولت عطا فرمائی۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے پھر اللہ نے میرے ذریعے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور تم میں اتفاق پیدا کیا"۔ انصار کہنے لگے :"بیشک اللہ اور رسول کا احسان اور فضل و کرم سب سے بڑھ کر ہے۔" آپ ﷺ نے فرمایا:"اے گروہ انصار! کیا تم مجھے کوئی جواب نہ دو گے؟" انصار نے کہا:"یا رسول اللہ ہم آپ ﷺ کو کس قسم کا جواب دیں گے، ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ سب اللہ اور اس کے رسول ہی کا احسان اور فضل و کرم ہے"۔ آپ ﷺ نے فرمایا:"نہیں، خدا کی قسم تم چاہتے تو یہ جواب دے سکتے تھے کہ اور (اگر تم یہ جواب دیتے تو) تم اپنی بات میں بالکل سچے ہوتے اور تمہاری سچائی کو تسلیم بھی کیا جاتا کہ تم ہمارے پاس اس حال میں آئے کہ لوگوں نے تمہارا انکار کیا، ہم نے تمہاری تصدیق کی۔ تمہیں لوگوں نے بالکل اکیلا چھوڑ دیا تھا، ہم نے تمہاری مدد کی۔ تمہیں گھر سے نکال باہر کیا تھا، ہم نے تمہیں پناہ دی۔ تم محتاج
تھے، ہم نے تمہیں مال و دولت دیا"۔[32]

اس سے بڑی گواہی اور کیا ہو سکتی ہے جو خود رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے مل رہی ہے؟ یہ اہل مدینہ کے جذبۂ ایمانی پر ایک پیغمبر کا یقین ہی تو تھا کہ جس کے باعث انہوں نے دیگر لوگوں کے مقابلے میں اہل مدینہ کو مال و دولت کی حرص سے بے نیاز سمجھا اور یہ امید کی کہ مال غنیمت میں کوئی حصہ نہ ملنے پر ان کے ایمان میں کوئی لغزش نہیں آئے گی۔ یہ تمام تاریخی حقائق ثابت کرتے ہیں کہ اہل مدینہ نے آپ ﷺ کو کسی قسم کے دنیوی مقصد کے تحت اپنے شہر میں آنے کی دعوت نہیں دی تھی۔ بلکہ ان کی خواہش تھی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی قیادت و رہنمائی میں اس دین کی برکتوں سے مکمل طور پر فیض یاب ہو سکیں جس کی صداقت پر وہ صدقِ دل کے ساتھ ایمان لا چکے تھے۔ فرانسیسکو جبرئیلیلکھتے ہیں:

> What drove theseMedinese to entrust their fate and that of their city to the still controversial and despised prophet from Mecca? There can be no reasonable doubt that the earliest of them were moved primarily by the religious essence of his messsage.[33]
>
> کس بات نے اہل مدینہ کو اس بات پر اکسایا کہ اپنی اور اپنے شہر کی قسمت مکہ کے ایک متنازعہ اور ناپسندیدہ نبی کے حوالے کر دیں؟ اس بارے میں شک کی کوئی خاص وجہ نہیں کہ ان (مسلمانوں) میں سے اولین بنیادی طور پر آپ ﷺ کے پیغام کی مذہبی سچائی سے ہی متاثر ہوئے تھے۔

یہاں خود ایک مستشرق کی زبان سے اقرار کیا جا رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے تشریف لانے سے انصار کو اپنے شہر کے دفاع اور امن و امان کے حوالے سے مزید خطرات کا سامنا ہو سکتا تھا کیونکہ جس پیغمبر کو وہ اپنے شہر میں آنے کی دعوت دے رہے تھے، انہیں مکے کے بڑے بڑے سرداروں کی مخالفت کا سامنا تھا اور وہ ان کے مدینہ میں آباد ہو جانے پر چین سے بیٹھنے والے نہ تھے۔ لہذا یہ کیونکر ممکن ہے کہ انصار اپنے مسائل کے حل کے لئے ایک ایسی شخصیت کو دعوت دیتے جن کی حمایت انہیں مزید مشکلات کا شکار کر سکتی تھی۔ یہ ان کی رسول اللہ ﷺ سے بحیثیت ایک پیغمبر کے عقیدت ہی تھی جس کی بنا پر انہوں نے تمام عرب کی مخالفت کے اندیشے کے باوجود آپ ﷺ کو نہ صرف مدینہ بلایا بلکہ اس کے بعد آپ ﷺ کی ہر پکار پر آمنا و صدقنا بھی کہا۔ انصار مدینہ کے مذہبی جوش و جذبے کا ذکر کرتے ہوئے ایڈیتھ ہالینڈ لکھتے ہیں:

> انسان اس جوش و جذبے کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے جو محمد (ﷺ) نے اپنے ابتدائی عقید تمندوں میں پیدا کر دیا تھا۔ انہوں نے کسی دنیوی مال و متاع کا وعدہ کر کے لوگوں کو اسلام میں داخل نہیں کیا کیونکہ اسلام لانے والے تو تب نفرت اور ظلم کا شکار تھے؛ (بلکہ) انہیں اپنا سب کچھ قربان کرنا ہوگا اور اگر وہ اس جدوجہد میں جان کی بازی ہار گئے تو جنت کی نعمتیں ان (کی قربانیوں) کا بدلہ ہوں گی۔ اس طور پر (ہی) بیعت عقبہ اولیٰ بھی کی گئی۔[34]

ثالثی کے نظریئے کے حامی ڈی۔ ایس۔ مارگولیتھ بھی ایک مقام پر اہل مدینہ کے توحید کے بارے میں جوش و خروش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ایک مرتبہ جب یثرب میں اسلام کی اشاعت شروع ہوگئی تو بعض نوجوان نو مسلموں نے اپنے مذہبی جذبے کا اظہار کرنے کے لئے بتوں کو جلایا۔ بتوں کو کتوں سے جوڑ دیا جاتا، کنوؤں میں غرق کر دیا جاتا، وہ چیز جو ان کے لئے پہلے بہت زیادہ معزز تھی، اب اسے انتہائی سنجیدگی سے خاک میں روندا جا رہا تھا؛ نئے خدا سے عقیدت کی شدت میں وہ پرجوش نو مسلمپرانے مذہبی عقائد پر حملے کرنے لگے۔ اپنے رقیب قبائلیوں کی گردنیں کاٹنے کی بجائے اب ان بتوں کی گردنیں توڑنے لگے۔[35]

گویا اسلام لانے کے بعد اہل مدینہ نے بتوں سے مکمل بیزاری کا اظہار کیا۔ اس سے کم از کم یہ تو ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام کے لئے ان کی لگن بالکل سچی تھی اور وہ بطور ایک دین اس پر ایمان لائے تھے۔ اور اگر وہ اسلام پر ایمان لے آئے تھے تو ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ پر بھی بحیثیت ایک رسول کے ایمان لائے تھے۔ چنانچہ خود ثالثی کا مفروضہ پیش کرنے والے مستشرق اس بات پر اتفاق کر رہے ہیں کہ اہل مدینہ نے آپ ﷺ کو پیغمبر تسلیم کر لیا تھا۔ یہ حقیقت مان لینے کے بعد اس سوچ کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ اہل مدینہ نے آپ ﷺ کو بطور پیغمبر نہیں بلکہ بطور ثالث مدینہ آنے کی دعوت دی تھی۔

رسول اللہ ﷺ کو حکمرانی کا خواہشمند قرار دینا

ہجرت مدینہ کے اسباب و پس منظر کو بیان کرتے ہوئے اکثر مستشرقین نے یہ تصور پیش کیا ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے نہ صرف مدینہ کی طرف ہجرت وہاں حکمرانی کے حصول کے لئے کی تھی بلکہ مکہ میں بھی آپ ﷺ خفیہ طور پر ایسے ہی عزائم رکھتے ہوں گے جو بعد میں مدینہ میں کھل کر سامنے آئے۔ طور اینڈرے صرف اس بات کو بنیاد بناتے ہوئے کہ مدینہ آنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو جو مقام حاصل ہوا وہ مکہ میں حاصل نہیں تھا، یہ دعویٰ کرتے ہیں:

> اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مقبول نظریہ غلط ہے (جس کے تحت سمجھا جاتا ہے) کہ محمد (ﷺ) مدینہ میں صرف ایک پارسا پیغمبر کا کردار ادا کر رہے تھے جو خالصتاً مذہبی عزائم رکھتے تھے جن کے ساتھ کسی قسم کے سیاسی اور سماجی مقاصد وابستہ نہیں تھے اور یہ کلیتاً مدینہ کے حالات تھے جن کے باعث انہیں سیاسی اقتدار مل گیا اور انہوں نے اچانک ہی ایک مذہبی ریاست کے حکمران کا کردار سنبھال لیا اور سیاسی اقتدار کا دعویٰ کر دیا۔[36]

یعنی مدینہ میں آپ ﷺ کے حکمران بننے سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ مکہ میں بھی آپ ﷺ نے ایسے ہی اختیارات حاصل کرنے کی کوششیں کی ہوں گی جن کے باعث قریش آپ ﷺ کے مخالف ہوگئے ہوں گے۔ ایک طرف مصنف کا یہ مفروضہ ہے اور دوسری طرف قرآن، احادیث اور تاریخ سے ملنے والے حقائق ہیں جن سے واضح ہو رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں ایسا کوئی مطالبہ نہیں کیا کہ آپ ﷺ کو حکمران بنا لیا جائے یا کسی بھی قسم کا کوئی اقتدار دیا جائے۔ اہل مکہ نے خود آپ ﷺ کو دولت و اقتدار کا لالچ دیا تب بھی آپ ﷺ نے ان کی پیشکش قبول نہیں فرمائی اور دعوت اسلام کو جاری رکھا۔[37]

منٹگمری واٹ ان اصحابِ رسول کو جنہیں رسول اللہ ﷺ نے تبلیغ اور تعلیمِ دین کے لئے مدینہ بھیجا تھا، آپ ﷺ کا جاسوس قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ محمد (ﷺ) نے اپنے کچھ ساتھیوں کو مدینہ بھیجا، بظاہر اہل مدینہ کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کے لئے، لیکن غالباً اس لئے بھی کہ وہ اس معاشرے کی اندرونی سیاست کا براہ راست مشاہدہ کر سکیں اور محمد (ﷺ) کو اس سے آگاہ کر سکیں۔[38]

یعنی رسول اللہ ﷺ مدینہ کی مکمل صورتحال سے آگاہ نہیں تھے جس کا جائزہ لینے کے لئے انہوں نے حضرت مصعب بن عمیر کو بظاہر داعی بنا کر بھیجا۔ گویا آپ ﷺ مدینہ کے مکمل حالات کا جائزہ اس لئے لے رہے تھے تاکہ وہاں کی ناساز گار صورتحال کو اپنے حق میں استعمال کرنے کے لئے منصوبہ بندی کر سکیں۔ یہاں ایک بار پھر واٹ کا نقطۂ نظر صرف ذاتی اندازوں پر مبنی ہے اور موضوعی ہے۔ اس میں کوئی تاریخی اور موضوعی سچائی نہیں پائی جاتی۔ حضرت مصعب بن عمیر مدینہ میں خالصتاً ایک داعی کے طور پر گئے تھے اور اپنی دعوتی ذمہ داریوں کو اس طور پر نبھایا کہ مختصر سے عرصے میں اوس و خزرج کی اکثریت اسلام میں داخل ہو چکی تھی۔ ہمیں ایسی کوئی روایات نہیں ملتی جس سے معلوم ہو کہ حضرت مصعب بن عمیر نے رسول اللہ ﷺ کو مدینہ کے سیاسی حالات سے آگاہ کرنے کے لئے ان سے کوئی خصوصی ملاقات کی ہو یا کوئی شخص اس مقصد کے لئے آپ ﷺ کی طرف روانہ کیا ہو۔ اگرچہ اس طرح کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا جس سے ثابت ہو سکے کہ حضرت مصعب بن عمیر یا کسی اور صحابی کی طرف سے آپ ﷺ کو مدینہ کے اندرونی حالات کی مسلسل خبریں پہنچائی گئی ہوں، البتہ اگر ایسی کوئی روایت موجود بھی ہوتی تب بھی اس سے یہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ آپ ﷺ کے بھیجے ہوئے صحابی تبلیغ دین کے لئے نہیں بلکہ جاسوسی کیلئے مدینہ گئے تھے۔ کیونکہ جس شہر میں آپ ﷺ اپنے پیروکاروں کو بھیجنے والے تھے، اس کی اندرونی صورتحال کے بارے میں جاننا نہ صرف آپ ﷺ کا حق تھا بلکہ آپ ﷺ کے لئے انتہائی ضروری بھی تھا۔

اکثر مستشرقین یہ رائے پیش کرتے نظر آتے ہیں کہ مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کی شخصیت و کردار، طریقۂ کار اور مقاصد مکی دور سے بہت مختلف تھے۔ کینیتھ کریگ لکھتے ہیں:

> This event(Hijrah),…makes the story of Islam a tale of two towns. The transition also marks an evident development in the function of the Prophet, implicit in the emergence of the preacher into the ruler, the "warner"into the warrior.[39]

> ہجرت کے واقعے سے اسلام کی داستان دو شہروں کا قصہ بن جاتی ہے۔ یہ تبدیلی پیغمبر کے کردار میں بھی ایک واضح ارتقاء کی نشاندہی کرتی ہے جو ایک مبلغ کے حکمران بن جانے اور ایک منذر کے جنگجو بن جانے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

کینیتھ کریگ بڑے ڈھکے چھپے اور بالواسطہ انداز میں ایک مقام پر آپﷺ کو ایک موقع پرست حکمران قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ماضی میں دیکھیں تو مصائب سہنے والے اس رسول کی زندگی میں عظمت کے واضح عناصر ہجرت کے بعد ایک حکمران کی موقع پرستی اور ملی جلی شان و شوکت کے مقابلے میں زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔[40] لیمنز کے بقول ہجرت محمد (ﷺ) کی زندگی میں جو تبدیلی لائی وہ کم دلچسپ نہیں تھی؛ اس سے اسلام کے سیاسی ارتقاء کا آغاز ہوا؛ پیغمبر ایک ریاست کا حکمران بن گیا۔[41] فلپ کے حٹیکے نزدیک ہجرتِ مدینہ حضرت محمد (ﷺ) میں چھپی سیاسی شخصیت کو منظر عام پر لے آئی، وہ لکھتے ہیں:

> The seer in him now recedes into the background and the practical man of politics comes to the fore. The Prophet is gradually overshadowed by the statesman.[42]

> ان میں موجود غیب دان اب پس منظر میں چلا جاتا ہے اور سیاست کا عملی شخص سامنے آتا ہے۔ اب ایک حکمران پیغمبر پر غالب آجاتا ہے۔

گب کے نزدیک یہ نقطۂ نظر درست نہیں کہ مدینہ آنے کے بعد حضرت محمد (ﷺ) کی شخصیت میں کوئی بڑی تبدیلی آئی اور انہوں نے ایک نبی سے ایک حکمران کا روپ دھار لیا۔ اس کے خیال میں محمد (ﷺ) کے ذہن میں شروع سے ہی ایک ایسے مذہب کا تصور تھا جس کا سیاست سے گہرا تعلق تھا۔ مکہ میں انہیں اس کے اطلاق کا موقع نہیں مل سکا۔ لہذا اسلام کی یہ مکمل صورت مدینہ میں ظاہر ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں:

> In his expositions of prophetic history this was an essential part of the Divine purpose in sending prophets.[43]

> ان کی پیش کردہ تاریخ انبیاء کی رو سے یہ انبیاء کو بھیجنے کا اہم ترین الٰہی مقصد تھا۔

کینیتھ کریگ لکھتے ہیں کہ بلاشبہ محمد (ﷺ) یہ بات سمجھتے تھے کہ ایک پیغمبر کے منصب میں ایک بادشاہ کی ذمہ داریاں اور مذہبی و سیاسی قیادت دونوں شامل تھیں۔ اور ہم اس خوشی کا تصور کر سکتے ہیں جو ایک ایسے شخص نے جو حکمرانی کی مکمل اہلیت رکھتا تھا اس وقت محسوس کی ہوگی جب اس نے خود کو بالآخر ایک ایسے مقام پر پایا جہاں وہ اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر سکتا تھا۔[44]

ہر پیغمبر کا اپنی امت سے پہلا مطالبہ یہی ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی وحدانیت اور اس کی نبوت پر ایمان لے آئے۔ ہر امت سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ زندگی کے ہر معاملے میں اپنے پیغمبر کی اطاعت کرے۔ کیا حضرت موسیٰؑ زندگی کے ہر معاملے میں بنی اسرائیل کے لئے حکم کا درجہ نہیں رکھتے تھے؟ کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی موجودگی میں بنی اسرائیل نے کسی اور شخص کو اپنا قائد بنایا تھا اور کیا ایسا کرنا ان کیلئے جائز ہوتا؟ جب حضرت موسیٰؑ فرعون کے دربار میں آئے اور اس کے سامنے اللہ کی ربوبیت اور اپنی رسالت کا اعلان کیا تو کیا اس وقت ان کا مقصد فرعون کو اپنا مطیع بنا کر اس کی جگہ خود حکمرانی کا منصب سنبھالنا تھا؟ کیا حضرت داود اور حضرت سلیمان علیہ السلام نبی ہونے کے ساتھ ساتھ بادشاہ نہیں تھے؟ حقیقت یہ ہے کہ مذہب اور سیاست کے جدا ہونے کا تصور کسی بھی پیغمبر نے پیش نہیں کیا۔ یہ تصور عیسائیت میں دیا گیا ہے نہ یہودیت میں۔ بلکہ سیاست اور مذہب کے الگ ہونے کا تصور ہمیشہ سے مغربی تہذیب کا خاصا رہا ہے۔ تہذیبی تصادم کے نظریئے سے عالمی شہرت پانے والے مصنف سیموئیل پی ہنٹنگٹن (Samuel P. Huntington) لکھتے ہیں:

> پوری یورپی تاریخ میں کلیسا جو بعد میں کئی کلیساؤں میں تقسیم ہو گیا ریاست سے جدا رہا ہے۔ مغربی تہذیب میں خدا اور

سیزر، کلیسا اور ریاست، روحانی اور جسمانی اقتدار کی ثنویت ہمیشہ غالب رہی ہے۔ کلیسا اور ریاست کے درمیان علیحدگی اور بار بار ہونے والا ٹکراؤ جو مغربی تہذیب کا خاصا رہا ہے، کسی اور تہذیب میں موجود نہیں رہا۔[45]

گویا مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کی حکمرانی پر ہونے والے تمام اعتراضات کی بنیاد ایک ایسا نظریہ ہے جس کی بنیاد کوئی مذہبی نظریہ ہے نہ کوئی عالمی تہذیبی تصور۔ بلکہ اس نظریئے کی بنیاد صرف ایک خاص تہذیب کے سیاسی نظریئے میں ہے جس کی رو سے مذہب کو سیاست سے ہمیشہ الگ رکھا جانا چاہئے۔ اس بحث سے قطع نظر کہ مغربی تہذیب نے کبھی خود اس اصول کی مکمل پیروی کی یا نہیں، محض اتنا کہنا کافی ہے کہ ایک خاص تہذیبی تصور کی رو سے ایک پیغمبر کی زندگی اور تعلیمات کی جانچ ایک خاص گروہ کے لئے تو شاید کوئی اہمیت رکھتی ہو مگر کسی عالمگیر سچائی کی حامل کہلا سکتی ہے نہ تحقیق کے غیر جانبدارانہ اصولوں کی رو سے قابل قبول ٹھہر سکتی ہے۔ سٹین لی لین پول بحیثیت حکمران رسول اللہ ﷺ کے کردار کو پیغمبری کا تقاضا قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> He governed the nation as a prophet and not as a king, and as a prophet his ordinances must be endorsed with the divine afflatus.[46]
>
> انہوں نے (اپنی) قوم پر ایک بادشاہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک پیغمبر کی حیثیت سے حکومت کی اور بطور پیغمبر ربانی الہام کے ذریعے ان کے احکامات کی تائید لازمی تھی۔

تاریخ انبیاء سے واقفیت رکھنے والے اور مقام انبیاء سے آشنا ہر شخص کے لئے یہ امر ہرگز بھی باعث حیرت یا قابل اعتراض نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ ﷺ کو بطور پیغمبر اپنی قوم کی سیاسی، معاشرتی، معاشی اور جنگی سیادت کے تمام اختیارات بھی مکمل طور پر حاصل تھے۔ یہ منصبِ نبوت ہی کا تقاضا تھا کہ آپ ﷺ کی موجودگی میں کسی بھی معاملے میں آپ ﷺ کو چھوڑ کر کسی اور کو رہنما نہ بنایا جائے۔ اسلئے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو کامل نبوت کا امتیاز عطا کیا تھا۔ جس میں زندگی کے ہر پہلو سے متعلق رہنمائی موجود ہے۔ آپ ﷺ کی نبوت اور آپ ﷺ کی حکومت دونوں کا ماخذ وحی الٰہی ہے۔ آپ ﷺ نے ایسا کوئی حکم دیا نہ کوئی ایسا قانون بنایا جس کی بنیاد آپ ﷺ کی ذاتی خواہش ہو۔ آپ ﷺ کے ہر حکم کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات تھی۔ فرمان الٰہی ہے:

وَما يَنْطِقُ عَنِ الْهَوى 0 إِنْ هُوَ إِلاَّ وَحْيٌ يُوحى [47]

ترجمہ: اور وہ اپنی خواہش نفس سے کوئی بات نہیں کہتے، یہ تو وحی ہے جو ان کی طرف بھیجی جاتی ہے۔

آپ ﷺ نے سیاست، حکومت، معاشرے یا معیشت کے حوالے سے جو بھی حکم دیا اس کا ماخذ وحی الٰہی ہی تھی۔ رسول کو مبعوث کرنے کا مقصد اس وقت تک پورا ہو ہی نہیں سکتا جب تک اس کی امت اس کے بتائے گئے ہر حکم پر صدق دل سے ایمان نہ لے آئے۔ اگر یہ کہا جانے لگے کہ پیغمبر کا دائرہ صرف روحانی معاملات تک محدود رہنا چاہئے اور ملکی انتظام و انصرام میں اس کی رائے کی کوئی اہمیت نہ ہونی چاہئے تو ایسی صورت میں اس پیغمبر کی قوم اس کامل ہدایت سے محروم رہ جائے گی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغمبروں پر نازل کی جاتی ہے تاکہ وہ اسے اپنی قوم تک پہنچا دیں۔ اگر کسی قوم کو یہ حق دے دیا جائے کہ وہ اپنے پیغمبر کے دائرہ عمل کا تعین خود کرے گی تو کیونکر ممکن ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کے احکام کے آگے اس طرح سے سر تسلیم خم کرے جس طرح کہ پیغمبر کا حق ہے۔ ایسی صورت میں تو انہیں آسان بہانہ میسر آجائے گا کہ وہ پیغمبر کے جس حکم کو چاہیں مانیں اور جس حکم کو چاہیں رد کر دیں۔ جبکہ ایمان بالرسالت کا اصول یہ ہے کہ رسالت کی صدق دل سے تصدیق کرتے

ہوئے اس بات کا عہد کیا جائے کہ ہر معاملے میں پیغمبر کی اطاعت کی جائے گی۔ پیغمبر کی مخالفت محض ایک عام اختلاف کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ وہ کفر کے حکم میں داخل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی حکمرانی پر کئے جانے والے تمام اعتراضات در حقیقت منصبِ نبوت سے عدم واقفیت کا ثبوت ہیں اور ان کی بنیاد مغربی تہذیب کے ان مادی اصولوں پر قائم ہے جن کی رو سے دنیوی معاملات کو چلانے کا حق ایک دنیادار حکمران کو ہونا چاہئے اور پیغمبر کا کام صرف عقیدہ وعبادت کی تعلیم تک محدود رہنا چاہئے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی حیات مبارکہ کی حقیقی تشریح وتوضیح کا حق صرف وہی گروہ ادا کر سکتا ہے جس کا تصورِ نبوت الہامی ہدایت کے عین مطابق ہو۔ منصب نبوت کے حقیقی تقاضوں کو سمجھنے کے بعد سیرت نبوی ﷺ کے مختلف گوشوں کے بارے میں دانستہ یا نادانستہ طور پر پیدا کئے جانے والے ان تمام ابہامات کا خود بخود خاتمہ ہو جاتا ہے۔

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 international license.

حواشی و حوالہ جات

[1] Toynbee, A.J., A Study of History, Oxford University Press, Londdon, 1951, 278/3.
[2] Canon Sell, The Life of Muhammad, The Christian Literature Society for India, Madras, 1913, p.80.
[3] W. Montgomery Watt, Islam and the Integration of Society, Routledge and Kegan Paul, London, nd, pp.14-18.
[4] Karen Armstrong, Muhammad: Prophet for our Time, Harper Collins Publishers, London, 2006, p.107.
[5] W. Montgomery Watt, Muhammad at Mecca, Oxford University Press, London, 2006, p.142.
[6] Muhammad at Mecca, pp.143-144.
[7] New Encyclopaedia Britannica, Macropaedia, Britannica Inc, Chicago/ London, 1974, 607/12.
[8] H.A.R. Gibb, Muhammedanism: A Historical Survey, Oxford University Press, New York, p.29.
[9] Encyclopaedia of Religion and Ethics, The Macmillan company, USA, 1968, 873/8.
[10] The Encyclopaedia of Islam, Leiden, New York, 1993, 366/7.
[11] New Encyclopedia Brittanica,647/15.
[12] Emile Dermengham, The Lifeof Mahomet, (Translator: ArabellaYorke), George Routledge&Sons, London, 1930, p.143.
[13] Islam and the Integration of Society, pp.18-21.
[14] Philip K. Hitti, History of the Arabs, Macmillan Company, New York, 1962, p.116.
[15] Bernard Lewis, The Arabs in History, Hutchinson House, London, 1950, p.41.
[16] John L. Esposito, Islam: The Straight Path, Oxford University Press, New York, 1988, p.11.
[17] ابن ہشام، **السیرة النبویة**،(مصر:شرکة مکتبة ومطبعة مصطفی البابی،1955م)،ج1،ص584۔
[18] ایضاً ج1،ص446۔
[19] Thomas Kiernan, The Arabs, their History, Aims and Challenges to the Industrial World, Abacus Edition, London, 1978, p.102.
[20] History of the Arabs, pp. 88-89.
[21] Muhammad at Mecca, p.142.
[22] Ibid, p.143.
[23] John BagotGlubb, The Life and Times of Muhammad, Stein & Day, New York, 1971, p.142.
[24] Emile Dermengham, The Life of Mahomet, (Translator : ArabelaYorke), George Routledge& Sons, London, 1930, p.143.
[25] Philip K. Hitti, Makers of ArabHistory,St. Martin’s Press, New York, 1968, p.12.

[26] Gustav E Von Grunebaum, Classical Islam- A History 600-1258, (Translator: Katherine Watson), George Allen &Unwin, London, 1969, p.35.
[27] Alfred Guillaume,Islam, Cassell& Company LTD, London, 1963, pp.38-39.
[28] Kenneth Cragg,The Call of Minaret, Oxford University Press, London, 1956, pp.81-82.
[29] ابن هشام، **السيرة النبوية**، ج1، ص429۔
[30] ایضاً ج1، ص442۔
[31] W. Montgomery Watt, What is Islam? Longman, Green & Co., London, 1968, pp.102.
[32] ابن هشام: السيرة النبوية، 2/ 499
[33] Francesco Gabrieli, Muhammad and the Conquests of Islam,(Translators:VirginiaLuling& RosamundLinel), Weidenfeld& Nicholson, London, 1968, p.60.
[34] Edith Holland, The Story of Mohammed, George G. Harrap& Co., London, 1914, p.76.
[35] D.S. Margoliouth, Mohammad and the Rise of Islam, G.P. Putman's Sons, New York, 1905, p.202.
[36] Tor Andrae, Mohammed: The Man and His Faith, (Translator: TheophilMenzil), Harper & Brothers, New York, 1960, p.133.
[37] ابن هشام، **السيرة النبوية**، ج1، ص293۔
[38] Muhammad: Prophet and Statesman, p.83.
[39] The Call of Minaret, p.72.
[40] The Call of Minaret, p.83.
[41] Henri Lammens, Islam: Beliefs and Institutions, (Translator: E. Denison Ross), Methuen & Co. , LTD, London, 1929, p. 27.
[42] History of the Arabs, p.116.
[43] Mohammedanism,p. 27.
[44] Muhammad and the Rise of Islam, p.215.
[45] Samuel P. Huntington, The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order, Viking, India, 1996, p.70.
[46] Stanley Lane Poole, The Prophet and Islam, National Book Society, Lahore, 1959, p.38.
[47] - القرآن 53:3-4۔